تصورات

اقبال کا عالمی نظام

پروفیسر محمد انور صادق

اقبال کے عالمی نظام اور امریکہ کے عالمی نظام کے مابین بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ اس لیے ان دونوں نظاموں کے درمیان تصادم کا رونما ہونا ناگزیر معلوم ہوتا ہے جسے مغربی دنیا میں ''تہذیبی تصادم'' کا نام دیا جارہا ہے اور وہ اکیسویں صدی میں فیصلہ کن معرکہ آرائی کی پیش بندی کر رہی ہے امریکہ کا دانشور طبقہ بھی اس ممکنہ محاذ آرائی کا جواز فراہم کرنے کے لیے نظریہ سازی میں مصروف ہے۔ مثال کے طور پر ہارورڈ یونیورسٹی میں علم سیاسیات کے پروفیسر سموئیل پی ہنٹنگٹن نے ''سلامتی کا بدلتا ہوا ماحول اور امریکہ کے قومی مفادات'' کے عنوان سے اپنے تحقیقی مقالہ میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اشتراکی نظام حکومت کی ناکامی کے بعد آئندہ عالمی سیاست میں قومی بقا کی جنگ زیادہ تر تہذیبی محاذوں پر ہی لڑی جائے گی۔ اس لیے ہمیں مغربی تہذیب کی حفاظت کی خاطر اپنے تہذیبی دشمنوں سے باخبر رہنا ہوگا۔ پروفیسر موصوف کے نزدیک مغربی تہذیب کو کنفیوسش اور اسلامی تہذیبوں کے اتحاد سے خطرہ لاحق ہوسکتا ہے اس لیے ہمیں ہر ایسے امکان کا خاتمہ کر دینا چاہیے جس کی بدولت یہ تہذیبی اتحاد قائم ہوسکتا ہو۔ یاد رہے کہ پروفیسر ہنٹنگٹن کا یہ نظریہ ۱۹۹۳ء میں پہلی بار منظر عام پر آیا جبکہ اقبال نے تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ آج سے تقریباً چورانوے سال پہلے ہی پیش کر دیا تھا۔ جیسا کہ وہ اپنے ایک مضمون ''قومی زندگی'' مطبوعہ ۱۹۰۴ء میں تحریر فرماتے ہیں:-

> ہاتھوں کی لڑائی کا زمانہ گزر چکا۔ اب دماغوں، تہذیبوں اور تمدنوں کی ہنگامہ آرائیوں کا وقت ہے اور یہ جنگ ایک ایسی جنگ ہے جس کے زخم رسیدہ زنگاری اور کافوری مرہم سے ہرگز اچھے نہیں ہوسکتے[۱]۔

واقعہ یہ ہے کہ اقبال کو اپنے قیام یورپ (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) کے دوران ہی میں احساس پیدا ہوگیا تھا کہ اس وقت دنیا کو ایک نئے عالمی نظام کی اشد ضرورت ہے کیونکہ یورپ کا موجودہ نظامِ تمدن جو سیاست میں لادین وطن پرستی، معیشت میں سرمایہ داری، معاشرت میں مرد و زن کی مساواتِ مطلق اور مذہب میں ذاتی اختیار کی آزادی جیسے مہلک تصورات پر مشتمل ہے نہ صرف عالمی نظام بننے کی صلاحیت سے محروم ہے بلکہ وہ بنی نوع انسان کے موجودہ مسائل اور مشکلات کا واحد ذمہ دار بھی ہے۔ اس لیے اقبال، یورپ کے نظامِ حیات کو بدل کر اس کی جگہ دنیا میں ایک نئے منصفانہ عالمی نظام کو نافذ کرنے کے آرزومند تھے۔ اقبال کی اس آرزومندی کا ابتدائی خاکہ بانگ درا کی ایک غزل ۱۹۰۷ء (یاد رہے کہ اس دور میں اقبال یورپ میں قیام پذیر تھے)، میں صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے جس میں ایک طرف مغربی نظامِ حیات کے مرنے کی نوید بھی ہے اور دوسری طرف ایک نئے عالمی نظام کے ظہور میں آنے کی امید بھی۔ اس لیے اقبال کی اس

غزل کو بجا طور پر نئے عالمی نظام کا اعلامیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے اہلِ مغرب کو واشگاف الفاظ میں خبردار کرتے ہوئے فرمایا:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہووہ اب زرِ کم عیار ہو گا!
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ، ناپایدار ہو گا[۲]

اقبال کو اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد یورپ سے واپس آئے ہوئے ابھی سات سال بھی نہ ہوئے تھے کہ مغربی تہذیب وتمدن کا خود اپنے ہاتھوں سے خودکشی کرنے کا عمل شروع ہو گیا یعنی ۱۹۱۴ء میں یورپی اقوام کے مابین جنگ عظیم اوّل چھڑ گئی۔ اقبال کے نزدیک اس جنگ کی بنیادی وجوہات خود مغربی تہذیب کے خمیر میں دریافت کی جا سکتی ہیں جن میں سے ایک وجہ حکومت اور مذہب کی جدائی کا تصور بھی ہے جس کی بدولت مغربی نظامِ حیات روحِ اخلاق سے عاری ہو گیا اور اس کا رخ دہریانہ مادیت کی طرف پھر گیا۔ بہر حال اقبال اپنے عمیق تر تہذیبی شعور کی بدولت اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے کا یورپ نہ صرف کسی نئے عالمی نظام کو جنم دینے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے بلکہ خود اس کی اپنی اجتماعی قدروں کا داخلی انتشار بھی کھل کر سامنے آ گیا ہے جس کی وجہ سے فرد اور معاشرہ دونوں کو شدید مایوسی کا سامنا ہے۔ اس لیے بقول اقبال ''اس وقت دنیا کو حیاتیاتی اعتبار سے زندہ ہونے کی ضرورت ہے''[۳]۔ لیکن یورپ کا نظامِ حیات جو خود شکست خوردگی کا شکار ہے دنیا کو دوبارہ زندہ کرنے کی صلاحیت سے قاصر ہے۔ اقبال نے یورپ کی پہلی عالمگیر جنگ کے نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی ایک تقریر میں فرمایا:

> میں نے آج سے پچیس برس پیشتر اس تہذیب کی خرابیاں دیکھی تھیں تو اس کے انجام کے متعلق پیش گوئیاں کی تھیں۔ اگرچہ میں خود بھی ان کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔ یہ ۱۹۰۷ء کی بات ہے۔ اس سے چھ سال بعد یعنی ۱۹۱۴ء میں میری یہ پیش گوئیاں حرف بحرف پوری ہو گئیں[۴]۔

اقبال کو جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں، مغربی نظامِ حیات کے یورپی عناصر کی موجودگی میں جو سیاست میں وطن پرستی اور حکومت و مذہب کی علیحدگی، معیشت میں سرمایہ داری، معاشرت میں مرد و زن کی مساوات مطلق اور مذہب میں ذاتی اختیار کی آزادی جیسے مہلک تصورات پر مشتمل ہے، نئے عالمی نظام کے فروغ کا خواب پورا ہوتے دکھائی نہیں دیتا اس لیے انہوں نے اس نظام کے تمام تشکیلی عناصر کو اپنی جارحانہ تنقید کا نشانہ بنایا اور دنیا بھر کو اس کے اندرونی کھوکھلے پن سے آگاہ کیا۔ مدراس (بھارت) کی مسلم خواتین کے سپاس نامہ کے جواب میں اقبال نے بجا طور پر فرمایا: ''یورپین تہذیب باہر ہی سے دیکھی جا رہی ہے۔ کبھی اندر سے دیکھی جائے تو رونگٹے کھڑے ہوں''۔ لیکن اقبال اس وقت کے معروضی حالات کے ماتحت مغربی تہذیب کے امریکی عنصر کے بارے میں اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے اور اس سے توقع رکھتے تھے کہ شاید آگے چل کر یہ عنصر نئے عالمی نظام کی تعمیر و تشکیل میں معاون ثابت ہو جیسا کہ وہ پیام مشرق

کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں:

امریکہ مغربی تہذیب کے عناصر میں ایک صحیح عنصر معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ ملک قدیم روایات کی زنجیروں سے آزاد ہے اور اس کا اجتماعی وجدان نئے اثرات وافکار کو آسانی سے قبول کرسکتا ہے[۵]۔

واقعہ یہ ہے کہ اقبال کی دُوررس نگاہوں نے امریکہ کی عالمی قیادت کے امکانات کو بیسویں صدی کے آغاز ہی میں بھانپ لیا تھا جس کا اظہار ان کے ایک تعزیتی خط سے ہوتا ہے۔ جوانہوں نے ۱۹۰۲ء میں ڈاکٹر سٹراٹن کی وفات پر ان کی بیگم کے نام لکھا تھا۔ اس خط میں وہ امریکہ کے عالمی کردار کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بلامبالغہ یہ صرف انہی کی شخصیت کا اثر تھا جس نے ہمیں اہل امریکہ اور ان کے شریفانہ ومخلصانہ (NOBLE AND DISINTERESTED CHARACTER) کردار کی طرف مائل کیا۔ وہ کینیڈا کے باشندے تھے لیکن ہم انہیں امریکی سمجھتے رہے کیونکہ یہاں کے لوگ اس فرق کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر سٹراٹن کی شخصیت ہی سے متاثر ہو کر بعض لوگ امریکی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں اور ان میں سے ایک میں بھی ہوں[۶]۔

اسی طرح تمدن ہی کے حوالے سے امریکہ کا ذکر کرتے ہوئے اقبال ۱۹۰۴ء میں اپنے ایک مضمون بہ عنوان ''قومی زندگی'' میں تحریر فرماتے ہیں:

حال کی قوموں کی طرف نظر دوڑاؤ تو معلوم ہوگا کہ امریکہ اور آسٹریلیا کی اصلی قومیں ایک اعلیٰ تر تمدن وتہذیب کے سیل رواں کے آگے قریباً قریباً نیست ونابود ہوگئی ہیں[۷]۔

اب ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا وجوہات ہوسکتی ہیں جن کے تحت اقبال کے دل میں یہ تاثر یا توقع پیدا ہوئی کہ عالمِ اسلام کے بجائے امریکہ ان کے نئے عالمی نظام کے خواب کی تکمیل میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے حالانکہ مارچ ۱۹۰۷ء کی غزل میں وہ بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

This was the time when Iqbal visualized a new world order emerging through the muslim countries.[8]

کی بات کر رہے تھے تو پھر یہ بیچ میں امریکہ بہادر کہاں سے آ گیا؟ راقم کے خیال میں اس کی بنیادی وجہ مذکورہ بالا غزل کے وہ الہامی خیالات ہیں جن کی کم از کم اس وقت کے معروضی حالات سے تائید نہیں ہو رہی تھی۔ جیسا کہ خود اقبال کے اپنے الفاظ ''اگرچہ میں خود بھی ان کا مطلب نہیں سمجھتا تھا'' سے ظاہر ہوتا ہے پہلی جنگِ عظیم سے قبل کے مغرب کے حالات جن میں اقبال کی یہ غزل تخلیق ہوئی، پر تبصرہ کرتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم نے تحریر کیا:

پہلی جنگِ عظیم سے قبل تک برٹش امپیریلزم بڑے زوروں پر تھی۔ انگریز صرف ہندوستان ہی کے مطلق العنان حاکم نہیں تھے بلکہ سیاست اور تجارت کے زور پر بالواسطہ یا بلاواسطہ نصف دنیا پر قابض تھے۔ انگریز کا رعب صرف ایشیا اور افریقہ پر نہیں بلکہ یورپ کے ممالک پر بھی تھا[۹]۔

اگر ایک طرف یورپ کے معروضی حالات اس غزل کے مفاہیم کی بظاہر تردید کر رہے تھے تو دوسری طرف عالمِ اسلام کے حالات بھی اس کے مضامین سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار بلادِ اسلامیہ کے ناگفتہ بہ معروضی حالات کے پیشِ نظر اقبال کی اس غزل کو شاعرانہ وجدان کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

Was this a poetic intution, at a time when muslim ummah was facing decadence everywhere?[10]

جس طرح جنگِ عظیم اوّل سے پہلے کے حالات اس غزل کے حوالے سے اسلام کے عالمی نظام کی بنیاد بننے کے لیے سازگار نہیں تھے۔ اسی طرح بعد کے حالات بھی مسلمانوں کے حق میں بہتر نہ تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کا انجام مسلمانوں کے حق میں بہت افسوسناک ہوا۔ طاقتور قوموں کا سارا نزلہ عالمِ اسلام پر گرا۔ ترکی خلافت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اتحادیوں نے اس کے مقبوضات کی بندر بانٹ کر لی۔ ترکی کا مشرقی حصہ روس کے ہاتھ لگا اور مغرب کے مشرقی صوبے بلقان، ہنگری اور بلغاریہ وغیرہ مکمل طور پر خودمختار قرار دے دیئے گئے۔ ایران اور شام عملاً فرانس کے قبضے میں چلے گئے۔ مصر اور عراق پر برطانیہ نے اپنا تسلط جما لیا۔ اس طرح عالمِ اسلام کے حصے بخرے ہو گئے[11] یہ تھے وہ معروضی حالات جنہوں نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد امریکہ کو دنیا میں ایک بین الاقوامی طاقت کی حیثیت سے ابھرنے کا موقع فراہم کیا۔ اقبال اس جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی، جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن سٹائن اور برگساں کی تصانیف میں ملتا ہے[12]۔

اب اگر پہلی جنگ عظیم کے حالات و واقعات اور اقبال کے پیامِ مشرق کے دیباچہ کے اس مخصوص حصے کے بین السطور کا جس میں انہوں نے پرانی دنیا کی تباہی، آئن سٹائن اور برگساں کے حوالے سے نئی دنیا کے ظہور اور امریکہ کی عالمی قیادت کے امکانات پر بات کی ہے۔ کا اگر بنظر غور مطالعہ کیا جائے تو اقبال کی مارچ ۱۹۰۷ء کی الہامی غزل کے مضامین کے برعکس، عالم اسلام کے بجائے، امریکہ سے نئے عالمی نظام کے فروغ کے سلسلے میں توقع باندھنے کا فیصلہ، معروضی حالات کے مطابق درست دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ اس وقت تک یورپ اور عالم اسلام دونوں ہی عالمی قیادت کی صلاحیت سے محروم ہو چکے تھے۔

اب تک کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اقبال کے خیال میں جنگِ عظیم اوّل کے بعد مغربی تہذیب و تمدن مکمل طور پر تباہ ہو چکی ہے اور اس کے کھنڈرات سے ایک نیا ثقافتی اور سیاسی منظر نامہ ابھر کر سامنے آ رہا ہے جس کا ایک دھندلا سا خاکہ آئن سٹائن اور برگساں کی تحریروں میں دیکھا جا سکتا ہے نیز اس خاکے میں امریکہ سے مزید رنگ بھرنے کی توقع وابستہ کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ وہ ثقافتی اعتبار سے ایسا کرنے کی صلاحیت سے مکمل طور پر بہرہ ور دکھائی دیتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا امریکہ اقبال کی توقعات کے مطابق اس خاکے

میں رنگ بھر کر اسے مزید جاذبِ توجہ بنا رہا ہے یا اسے مسخ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ جب ہم اس اعتبار سے امریکہ کے موجودہ عالمی کردار کا جائزہ لیتے ہیں تو بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ نہ صرف اقبال کی توقعات پر پورا نہیں اتر رہا بلکہ وہ ایک ایسے فلسفۂ حیات پر عمل پیرا ہے جو اقبال کے مجوزہ نئے عالمی نظام کے برعکس بھی ہے اور جس کا انجام تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ فلسفۂ حیات ولیم جیمز اور جان ڈیوی کا فلسفۂ نتائجیت (Pragmatism) ہے۔

اقبال کے مجوزہ نئے عالمی نظام کے مطابق امریکہ کا متوقع کردار یہ تھا کہ وہ اپنی مستحکم بین الاقوامی ساکھ کی بدولت اخوت، حریت اور مساوات جیسے اصولوں کی حکمرانی اور بالادستی قائم کرنے کے لیے دنیا کی رہنمائی کا فرض ادا کرتا لیکن اس کا موجودہ کردار نہ صرف ان اصولوں کی پامالی کا منہ بولتا ثبوت ہے بلکہ وہ خود غرضی، لوٹ کھسوٹ اور امیر و غریب میں تمیز روا رکھنے جیسی قدروں کے فروغ کا باعث بھی بن رہا ہے جس سے دنیا کا دامن امن و سلامتی اور عدل و انصاف سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔ امریکہ کا بنایا اور اپنایا ہوا راستہ نتائجیت کا فلسفہ ہے۔ اس لیے امریکہ اور اس کی اعلیٰ قیادت کے موجودہ عالمی کرداروں کی بہتر تفہیم کے لیے فلسفہ نتائجیت کو سمجھنا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر سی اے قادر کا خیال ہے کہ:

> بیسویں صدی کے پہلے ربع میں نتائجیت امریکہ میں بہت مقبول فلسفہ تھا۔ نتائجیت کو امریکی فلسفہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ اسی فلسفہ سے امریکہ کا ذہن منکشف ہوتا ہے[۱۳]۔

نتائجیت کا فلسفہ ہی اصل میں امریکہ کی پہچان ہے جس کے آئینے میں امریکی عوام کے مزاج، ان کی امنگوں اور قومی عزائم کو بے نقاب دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ نظریہ صداقت کی ایک نئی تعریف پیش کرتا ہے جسے ولیم جیمز نے اس لیے وضع کیا کہ امریکی عوام کے روّیوں اور ان کے قومی مقاصد کا جواز پیدا کیا جا سکے:

> اس نظریے کے تحت اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ انسان عملی فائدہ حاصل کرے اور فلسفیانہ سوالات اور حقیقی سچائیوں کی تلاش نہ کرے اس طرح نتائجیت کا فلسفہ امریکی سرمایہ دار حکمران طبقے کی ضروریات پر پورا اترتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے شروع سے آج تک نتائجیت امریکہ کا مقبول ترین فلسفہ رہا ہے[۱۴]۔

اس لیے نتائجیت کو بجا طور پر امریکہ کا قومی فلسفہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس کے تحت وہ پوری دنیا کے مادی وسائل پر کنٹرول حاصل کر کے اپنے سرمایہ دارانہ عزائم کی تکمیل میں خود کو حق بجانب سمجھتا ہے۔

نتائجیت کے فلسفہ کو بنیادی طور پر صداقت کا فلسفہ قرار دیا جاتا ہے جس کے مطابق صداقت کا معیار کسی خیال یا تصور کی عملی افادیت ہے۔ اگر وہ ہماری رہنمائی تسلی بخش نتائج کی طرف کرتا ہے تو وہ خیال یا تصور درست ہوگا بصورتِ دیگر اسے غلط قرار دیا جائے گا۔ نیز اس نظریے کے مطابق درست اور غلط کے تصورات مستقل نہیں ہوتے بلکہ مقامی اور اضافی ہوتے ہیں جو حالات اور مقام بدلنے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ یوں یہ فلسفہ عملاً افادیت پسندی کا فلسفہ بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر دنیا میں جہاں کہیں امریکہ کے عالمی مفادات کسی فوجی آمریت سے وابستہ ہوں وہاں وہ فوجی آمریت کی حمایت کرنے میں کوئی باک

محسوس نہیں کرتا اور جہاں اس کے مفادات جمہوریت کے ساتھ وابستہ ہوں وہاں وہ فوجی آمریتوں کا مخالف بن کر خود کو انسانی حقوق کی سربلندی کا چیمپئن ثابت کرتا ہے۔ اسرائیل اور بھارت کے ایٹم بم چونکہ امریکہ کے مفادات کے مطابق ہیں اس لیے وہ درست ہیں لیکن پاکستان کی پرامن جوہری حکمتِ عملی چونکہ امریکہ کے مفاد میں نہیں اس لیے وہ غلط ہے۔ یہ ہے ولیم جیمز اور جان ڈیوی کا فلسفہ نتائجیت جس پر امریکہ عمل پیرا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ امریکہ نے ولیم جیمز اور جان ڈیوی کے فلسفہ نتائجیت کو قبول کرنا کیوں ضروری خیال کیا۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمارا امریکی عوام کی نفسیات کو جاننا ضروری ہے۔ اس کی پہلی وجہ امریکی لوگوں کا ابھی تک اپنی الگ شناخت نہ ہونے کے باعث شدید طور پر احساسِ کمتری کا شکار ہونا ہے۔ وہ ابھی تک اپنے یورپی آباد کار اجداد کی ثقافتی غلامی سے نکل کر علیحدہ قومی شناخت کروانے کے عمل میں مصروف ہیں۔ امریکی عوام کو ولیم جیمز کے فلسفہ نتائجیت کی شکل میں اپنی علیحدہ شناخت نظر آئی۔ ولیم جیمز کے فلسفہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ول ڈیورنٹ نے لکھا ''ولیم جیمز کی آواز، اس کا بیان اور محاورہ تمام تر امریکی ہے''۔ جبکہ جارج سنتیانا پر اسی مصنف کا تبصرہ کچھ یوں ہے ''گمانِ غالب یہ ہے کہ اس کے بعد سنتیانا جیسا مفکر پیدا نہ ہوگا کیونکہ اس کے بعد امریکہ کا فلسفہ امریکی قلم بند کریں گے، یورپ کے رہنے والے نہیں ۹۵''۔ اب صاف ظاہر ہے کہ جو قوم خود شناسی کے جنون میں اپنے یورپی آباواجداد کی ثقافتی بالادستی تسلیم نہ کرتی ہو وہ بھلا تیسری دنیا کے ایک پسماندہ ملک کے شاعر کے مشوروں کو کیسے قبول کر سکتی ہے۔

امریکہ میں فلسفۂ نتائجیت کے مقبول ہونے کی دوسری وجہ وہاں کے لوگوں کی تاجرانہ ذہنیت ہے۔ وہ آئن سٹائن اور برگساں کے مابعد الطبیعیاتی مسائل میں الجھنے کے بجائے فوری، واقعی اور حقیقی مفاد کے حصول کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لیے نتائجیت کا فلسفہ امریکی مزاج سے زیادہ قریب ہے۔ ہونیکر کے نزدیک ''یہ تجارت پیشہ لوگوں کا فلسفہ ہے اور اس سے بنئے پن کی بو آتی ہے''۔ امریکہ درحقیقت عملی آدمیوں کا ملک ہے، عملی سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگوں کا ملک اور سخت گیر تجارت کرنے والوں کا ملک۔ ان کے نزدیک تو خدا کا تصور بھی افادی نقطہ نظر کا حامل ہے۔ بقول سید علی عباس جلال پوری ''اس فلسفے میں اگر خدا کی ہستی پر ایمان لانے سے انسان کو کسی قسم کا بھی فائدہ پہنچ سکے تو اس پر ایمان لانے میں چنداں مضائقہ نہیں گویا خدا پر ایمان لانا اس لیے ضروری نہیں کہ وہ فی الواقع موجود ہے بلکہ اس لیے لازم ہے کہ اس عقیدے سے انسان کو عملی فائدہ پہنچ سکتا ہے ۹۶''۔ اس لیے امریکیوں کے نزدیک ایسے اعلیٰ وارفع قسم کے افکار وخیالات جن کی کوئی عملی افادیت نہ ہو بے فائدہ ہوتے ہیں۔ امریکی عوام کے عملی رجحان پر تبصرہ کرتے ہوئے ول ڈیورنٹ نے بجا طور پر لکھا ہے:

> یہ فلسفہ (نتائجیت) دراصل نوجوان امریکہ کا یورپ کی مابعد الطبیعیات اور سائنس کے خلاف ایک مدافعانہ ردِعمل تھا ۱۷۔

نتائجیت کا فلسفہ اپنی تاجرانہ فطرت کی بنا پر جو ہر شے کی **Cash Value** دیکھتا ہے کسی فرد یا قوم کو امیر

تو بنا سکتا ہے مہذب نہیں بنا سکتا۔ مہذب بننے کے لیے کسی اعلیٰ نصب العین کا ہونا ضروری ہے جو نہ صرف فرد یا قوم کی مادی ضرورتیں پوری کرتا ہو بلکہ ان کے اخلاقی اور روحانی تقاضوں کی تسکین کا سامان بھی فراہم کرتا ہو۔ یہ صلاحیت نتائجیت کے فلسفے میں نہیں ہے اس لیے وہ کسی مستحکم تہذیب یا نظام کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ اس فلسفے نے امریکیوں کو امیر تو بنا دیا ہے مہذب نہیں بنایا۔ اس حقیقت کا اعتراف ایک امریکی دانشور نے خود ان الفاظ میں کیا ہے:

> ہمیں اتنا وقت نہیں ملا کہ اپنے ملک کا کوئی ادب اور ایک پختہ فلسفہ پیدا کر سکیں۔ دولت مند بننا پہلی ضرورت تھی۔ کیونکہ ایک قوم کو فلسفہ پیدا کرنے سے پہلے زندہ رہنے کی ضرورت ہے ہمارے ذہن ہمارے جسموں کے ساتھ اور ہماری ثقافت ہماری دولت کے ساتھ ساتھ ترقی کرنا شروع کر دے گی ۱۸۔

یہاں اس امر کی نشان دہی کرنا بھی ضروری ہے کہ امریکیوں کا تخلیقِ ثقافت کا تصور بھی محدود تر ہے جس کی توثیق ول ڈیورنٹ کے مندرجہ ذیل خیال سے ہوتی ہے۔ ''ہم دولت مند ہو چکے ہیں اور دولت فنون کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ ۱۹'' حالانکہ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ کسی قوم کا نظریہ ہی اس کی تہذیب و ثقافت کی تخلیق کا ذمہ دار ہوتا ہے نہ کہ دولت کی فراوانی۔

امریکہ اپنے قومی فلسفہ کے بنیاد پر دنیا میں نیا عالمی نظام نافذ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اس میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ تو آنے والی صدی میں ہوگا۔ مگر ایک بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جو فلسفہ امریکہ میں کسی مستحکم تہذیب و ثقافت کو جنم نہیں دے سکا وہ دنیا کو کیا عالمی ثقافت یا نظام دے سکے گا۔ امریکہ اگر امن و سلامتی، عدل و انصاف اور انسانی بھائی چارے کی بنیاد پر نیا عالمی نظام متعارف کروانا چاہتا ہے تو راقم کے خیال میں اسے اپنی بین الاقوامی حکمت عملی کا رشتہ اقبال کے تصورات سے جوڑنا پڑے گا۔ اسی صورت میں یہ نظام عالمی ثقافت کی بنیاد بن سکے گا۔ لیکن ابھی تو وہ نیو ورلڈ آرڈر کی راہ میں حائل ہونے والی ممکنہ رکاوٹوں کو دور کرنے میں مصروف ہے جن میں سے ایک رکاوٹ امریکیوں کی نظر میں مسلمانوں کی ''بنیاد پرستی'' ہے حالانکہ اسلام میں بنیاد پرستی کی گنجائش نہیں وہ تو ایک ترقی زا مذہب ہے۔ اس امر کا قوی امکان ہے کہ اقبال کے افکار و تصورات کو ''مسلم بنیاد پرستی'' کا حصہ قرار دے کر رد کر دے۔ موجودہ حالات میں امریکہ کے نئے عالمی نظام کے بارے میں اقبال کے الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے۔

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام! وائے تمنائے خام ۲۰

اقبال اگر آج زندہ ہوتے تو کیا وہ امریکہ کی موجودہ عالمی روش کو دیکھتے ہوئے اپنی توقع پر قائم رہتے جو پہلی جنگِ عظیم کی فضا میں ابھری اور جسے انہوں نے یہ سمجھتے ہوئے امریکہ سے وابستہ کر لیا کہ یہ ملک چونکہ ابھی تک قدیم روایات کی زنجیروں سے آزاد ہے اور اس کا اجتماعی وجدان نئے اثرات و افکار کو آسانی سے قبول کر سکتا ہے۔ اس لیے شاید یہ نئے عالمی نظام کے فروغ میں مددگار ثابت ہو۔ فکرِ اقبال کی روشنی میں

اس سوال کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ اور ہم بلاخوفِ تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ امریکہ اقبال کی توقع پر پورا نہیں اترا۔ تو کیا اب اقبال کا نئے عالمی نظام کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو گا! اقبال کا یہ خواب ضرور پورا ہو گا کیونکہ بقول پروفیسر محمد عثمان ''اقبال کے دوسرے خوابوں کی طرح یہ خواب بھی پورا ہونے کے لیے دیکھا گیا ہے''۔ مگر اس کی تکمیل امریکہ کے ہاتھوں نہیں، اس قوم کے ہاتھوں ہوگی جس کے بارے میں اقبال نے یہ شعر کہا تھا بشرطیکہ وہ قوم ان شرائط کو پورا کر دے جو اس شعر میں بیان ہوئی ہیں:

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا [۲۱]

اقبال دنیا بھر میں، ۱۔ احترام انسانیت کی بحالی، ۲۔ عدل و انصاف کی سربلندی، ۳۔ امن وسلامتی کے فروغ، ۴۔ آزادی و حریت کی محافظت کے پرجوش حامی اور ان تھک مجاہد تھے، ۵۔ وہ قوم پرستی کے مخالف، ۶۔ بنی نوع انسان کی وحدت کے علمبردار تھے۔ یہ ہیں وہ اصول جن پر اقبال اپنے نئے عالمی نظام کو استوار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو اپنے ایک نشری پیغام میں اقبال نے فرمایا:

انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے اور جب تک دنیا کی علمی قوتیں اپنی توجہ احترامِ انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی رہے گی [۲۲]۔

اقبال نے اپنے اس پیغام میں اگر ایک طرف تمام دنیا کی علمی قوتوں سے اپیل کی ہے کہ وہ احترامِ انسانیت کی سربلندی کے لیے مل جل کر کام کریں تو دوسری طرف عالمی حکمرانوں کے حق میں دعا بھی کی ہے کہ خدا انہیں اس مقصد کے حصول کی توفیق عطا فرمائے۔ اقبال جو خود بھی اس دنیا کی ایک بہت بڑی علمی قوت تھے، احترام انسانیت کی سربلندی کی خاطر تمام عمر سرگرمِ عمل رہے۔ کیا اقبال کا یہ شعر ان کے جذبے کا ترجمان نہیں ہے؟

آدمیت　احترامِ　آدمی
با خبر شو از مقامِ آدمی [۲۳]

احترامِ انسانیت کی سربلندی اور بنی نوع انسان کی وحدت کا حصول ممکن بنانے کی خاطر اقبال دنیا میں ایک ایسا نیا عالمی نظام قائم کرنے کے آرزومند ہیں۔ جس کا دامن معاشی ناہمواریوں رنگ و نسل کے امتیازات، مذہبی اور لسانی منافرت اور جغرافیائی حد بندیوں سے پاک صاف ہو اور جہاں ایک ایسی تہذیب و ثقافت فروغ پائے جس کی بنیاد عالمگیر اصولوں پر رکھی گئی ہو اور جس میں دنیا بھر کے انسانوں میں باہمی اعتماد، تعاون اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنے میں مدد ملتی ہو۔ پروفیسر محمد عثمان نے اقبال کے آرزو کردہ اسی نئے عالمی نظام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

اقبال فقط مفکرِ پاکستان نہیں وہ ان معدودے چند ابنائے آدم میں سے ہیں جنہوں نے عالمی ثقافت اور عالمی برادری کا خواب دیکھا ہے اور اقبال کے دوسرے خوابوں کی طرح یہ خواب بھی پورا ہونے کے لیے دیکھا گیا ہے [۲۴]۔

اقبال کے نزدیک نئے عالمی نظام کی تشکیل کے لیے آج انسانیت کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ اوّل کائنات کی روحانی تعبیر، دوم فرد کا روحانی استخلاص یعنی ہر قسم کے جبر اور توہم پرستی سے نجات اور سوم، وہ بنیادی اصول جن کی نوعیت عالمگیر ہو اور جن سے انسانی معاشرے کا ارتقاء روحانی اساس پر ہو سکے۔ اگرچہ یہ تینوں اصول اساسی طور پر اسلام میں موجود ہیں تاہم اقبال نے جدید ذہن کو براہِ راست اس طرح متوجہ نہیں کرایا بلکہ اسے آئن سٹائن اور برگساں کے نظریات پر غور و فکر کا مشورہ دیا ہے تاکہ مکمل بے تعصبی سے مشترکہ انسانی مقصد کو حاصل کیا جا سکے یعنی ایک مشترکہ نئے عالمی نظام کا فروغ۔ آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال تحریر فرماتے ہیں:

> آئن سٹائن کے نظریے نے کائنات کو ایک نئے روپ میں پیش کر دیا ہے اور ہم محسوس کر رہے ہیں کہ اس طرح ان مسائل پر بھی جو فلسفہ اور مذہب میں مشترک ہیں نئے نئے زاویوں کے ماتحت غور کرنا ممکن ہو گیا ہے[۲۵]۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کائنات کا وہ کون سا نیا روپ ہے جس کے ماتحت فلسفے اور مذہب کے مشترکہ مسائل پر غور کرنا ممکن ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آئن سٹائن کے نظریے سے پہلے کائنات کی تعبیر مادیت کی اساس پر کی جاتی تھی لیکن بقول ''اقبال مادے کے تصور پر سب سے زیادہ کاری ضرب عہدِ حاضر کے مشہور طبیعی آئن سٹائن کے ہاتھوں لگی جس کے اکتشافات نے فکرِ انسانی میں بڑا دوررس انقلاب پیدا کر دیا ہے''۔ اس نظریے کی رو سے مادہ اب موجود فی الخارج اور مکان کا محتاج یعنی ایک سخت، بسیط اور بدیہی شے نہ رہا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ باہم دگر مربوط حوادث کے ایک نظام میں بدل گیا جس سے جمود کا قدیم تصور ختم ہوا۔ اور یوں کائنات کی مادی تعبیر کی جگہ روحانی تعبیر کی راہ ہموار ہوئی۔ عقل و وجدان کے حوالے سے کچھ اسی قسم کے نتائج کی طرف برگساں نے ہماری رہنمائی کی۔ اقبال انہی وجوہات کی بنیاد پر جدید ذہن کو ان دونوں مفکرین کا مطالعہ کر کے کائنات کی روحانی تعبیر کی دعوت دیتے ہیں۔

کائنات کی روحانی تعبیر کے علاوہ اقبال نئے عالمی نظام کی نشو و نما کے لیے ایک ایسے معاشرے کے قیام کے آرزومند ہیں جہاں ہر فرد جبر و استحصال اور توہم پرستی سے آزاد ہو کر ادراک بالحواس کی مدد سے تسخیرِ کائنات کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مذہبی مشاہدات کی روشنی میں روحانی زندگی کی تکمیل کے عمل میں بھی مصروف رہ سکے۔ اقبال کے اس معاشرہ میں تسخیرِ کائنات سے حاصل ہونے والے مادی فوائد کو دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے استعمال کی اجازت نہیں ہو گی۔ بلکہ انہیں بنی نوع انسان کی خوشحالی اور فلاح و بہبود کے لیے بروئے کار لایا جائے گا۔ گویا اقبال کے عالمی نظام میں افراد ہوں یا اقوام سائنسی قوت کی بناء پر ایک دوسرے پر غلبہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اقبال کو آئن سٹائن کے تصورات میں ایسے ہی نظام کی ایک جھلک دکھائی دی تھی۔ اس لیے وہ ہماری توجہ اس جانب مبذول کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ہیوم کی تنقید کا مطلب یہ تھا کہ علومِ اختیاری یعنی سائنس کا دامن قوت کے تصور سے پاک ہو۔ آئن سٹائن کے تصورِ کائنات سے جو اس نے ریاضیات کے نقطہ نظر سے قائم کی گویا اس عمل کی

جس کی ابتداء ہیوم نے کی تھی، تکمیل ہوگئی جیسا کہ ہیوم کی تنقید کا تقاضا تھا۔ اس نظریے نے قوت کے تصور کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۲۶۔

اقبال کے نئے عالمی نظام کی تعمیر و تشکیل کا تیسرا اہم رکن ایسے آفاقی نوعیت کے اصولوں کی دریافت ہے جو روحانی بنیادوں پر انسانی معاشرے کے ارتقا میں ہماری رہنمائی کر سکیں۔ اقبال کے نزدیک بنی نوع انسان کی وحدت ہی وہ بنیادی اصول ہے جس پر عالمگیر انسانی معاشرے کا قیام ممکن ہوسکتا ہے نیز بنی نوع انسان کی وحدت کا یہ اصول توحید کے تصور سے حاصل ہوتا ہے اور اخوت، حریت اور مساوات اسی اصولِ توحید سے متفرع ذیلی تصورات ہیں۔ اقبال یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور ریڈیو سے اپنی ایک نشری تقریر میں عالمِ انسانیت سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

> وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو رنگ و نسل و زبان سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا۔ جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہوگا جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا۔ اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا۔ اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۲۷۔

اقبال کا مجوزہ نیا عالمی نظام درحقیقت اسلام ہی کا نیا عالمی نظام ہے۔ اس لیے وہ امریکہ کے مروجہ نئے عالمی نظام سے مفاہمت نہیں کر سکتا کیونکہ ان دونوں کے بنیادی اصولوں میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر حکومت اور مذہب کی جدائی کا تصور امریکہ کے مروجہ نئے عالمی نظام کا ایک اہم رکن ہے جس کے مطابق ہر وہ حکومت جو اپنے ریاستی معاملات میں مذہب سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتی ہے نہ صرف اسے دقیانوس، تنگ نظر اور بنیاد پرست جیسے القابات سے نوازا جاتا ہے بلکہ دنیا کے امن و سلامتی کے لیے خطرہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس اقبال کے مجوزہ نئے عالمی نظام میں دین و سیاست کی علیحدگی کا تصور مٹا دیا جائے گا اور ان دونوں کی یکجائی سے بنی نوع انسان کی بقاء اور حفاظت کا سامان فراہم کر کے دنیا کو امن و سلامتی کا گہوارہ بنا دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں اقبال کے نئے عالمی نظام میں مغرب کی جسمانی جمہوریت کی جگہ جس میں صرف بندوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا، اسلام کی روحانی جمہوریت کو فروغ دیا جائے گا کیونکہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا کی جاسکتی ہے جس کی بدولت ایک عالمی برادری کی تشکیل میں مدد مل سکتی ہے۔

دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی
دوئی چشمِ تہذیب کی نا بصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا

بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری[۲۸]

اقبال کے مجوزہ نئے عالمی نظام میں جہاں نظام حکومت اور طرز سیاست کو یکسر تبدیل کر دیا جائے گا وہاں نظام معیشت میں بھی انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں گی۔جن میں سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوگی کہ مال و دولت کو ہر قسم کی بدعنوانی سے پاک کر کے حکمرانوں اور صاحبِ ثروت لوگوں کو اس کا امین بنا دیا جائے گا اور وہ اسے بنی نوع انسان کی معاشی ترقی اور خوشحالی کے منصوبوں پر صرف کریں گے۔ نیز سرمایہ داری کی قوت کو امریکہ کے مروجہ نئے عالمی نظام کی طرح نہ تو حدِ اعتدال سے متجاوز ہونے دیا جائے گا اور نہ ہی روسی بالشوزم کی طرح معاشی نظام سے خارج کیا جائے گا۔ بلکہ اسلامی اصولوں کے مطابق میانہ روی کا راستہ اختیار کیا جائے گا۔اسی طرح اقبال کے مجوزہ نئے عالمی نظام میں انسانوں کا معاشرتی نظام بھی مختلف ہوگا جس میں ہر فرد،عورت ہو یا مرد، اپنے اپنے محاذ پر سرگرمِ عمل ہوگا۔اقبال کے نزدیک عورت کا بنیادی کردار امومت کے فرائض ادا کرنا ہے جبکہ روزگار کی فراہمی مرد کا بنیادی فریضہ ہے تاہم جہاں تک مساوات کا تعلق ہے اسلام کے اندر مرد و زن میں کوئی فرق نہیں ۔ دونوں کے حقوق برابر ہیں ۔اقبال مغربی نظامِ تمدن میں عورت کی معاشی آزادی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مغربی دنیا میں جب عورتوں نے گھر کی چاردیواری سے باہر نکل کر کسبِ معاش کی جدوجہد میں مرد کا ساتھ دینا شروع کیا تو خیال کیا جاتا تھا کہ ان کی یہ اقتصادی حریت دولت کی پیداوار میں معتد بہ اضافہ کرے گی لیکن تجربہ نے اس خیال کی نفی کر دی اور ثابت کر دیا کہ اس خاندانی وحدت کے رشتہ کو جو بنی نوع انسان کی روحانی زندگی کا جزوِ اعظم ہے یہ حریت توڑ دیتی ہے[۲۹]۔

اقبال کا نئے عالمی نظام کا خواب جو انہوں نے مارچ ۱۹۰۷ء میں قیام انگلستان کے دوران میں دیکھا تھا۔ بنیادی طور پر تین باتوں پر مشتمل ہے۔(۱) زوالِ مغرب کی پیش گوئی (۲) اسلام اور ملت اسلامیہ کے احیائے نو کی نوید (۳) اور اس سلسلے میں اقبال کی طرف سے فکری رہنمائی فراہم کرنے کا اعلان۔واقعہ یہ ہے کہ اقبال کا یہ خواب نوّے برس گزرنے پر بھی ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔مغربی نظامِ تمدن اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود پوری آب و تاب کے ساتھ دنیا پر مسلط ہے فرق صرف یہ پڑا ہے کہ اب اس کی قیادت یورپ کے بجائے امریکہ کے ہاتھوں میں ہے۔اسی طرح اسلام اور ملتِ اسلامیہ بدستور سیاسی ابتری، معاشی بدحالی اور معاشرتی انحطاط کے اندھیروں میں بھٹک رہی ہے نیز وہ خود انحصاری کی منزل سے دور ابھی تک غیروں کی محتاجی پر انحصار کئے ہوئے ہے۔اس ناگفتہ بہ صورت حال کی بنیادی ذمہ داری خود مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے مسلسل تعلیماتِ اقبال کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ راقم کے خیال میں اگر مسلمان اکیسویں صدی میں غیروں کی محتاجی سے آزاد خود انحصاری کی آبرومندانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو انہیں بہر طور تعلیماتِ اقبال سے رہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔اس سلسلے میں اقبال مارچ ۱۹۰۷ء کی تاریخی غزل میں

مسلمانوں کو آمادۂ انقلاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہو گا[۳۰]

اب صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف اقبال کا مجوزہ نیا عالمی نظام ہے اور دوسری طرف امریکہ کا مروجہ نیا عالمی نظام اور ان دونوں کے درمیان بیسویں صدی کا درماندہ مسلمان، جسے اکیسویں صدی میں داخل ہونے کا کوئی مناسب راستہ دکھائی نہیں دیتا۔اس لیے تاریخ کے اس نازک موڑ پر ہمیں دوٹوک فیصلہ کرنا ہوگا کہ کیا ہمیں اقبال کے مجوزہ نئے عالمی نظام کے مطابق اخوت، حریت اور مساوات کی زندگی بسر کرنا ہے یا امریکہ کے مروجہ نئے عالمی نظام کے تحت سیاسی غلامی، اقتصادی محتاجی اور معاشرتی ابتری کی زندگی۔ میرے خیال میں مسلمانوں کے جملہ مسائل کا حل اقبال کے نئے عالمی نظام میں ہے۔ اس لیے اس کے نفاذ اور ترویج واشاعت کے لیے بھرپور کوشش کرنا چاہیے اس سلسلے میں ابتدائی اقدام کے طور پر اقبال مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہوئے اپنے خطبے ''الاجتہاد فی الاسلام'' میں لکھتے ہیں:

بحالتِ موجودہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ امم اسلامیہ میں ہر ایک کو اپنی ذات میں ڈوب جانا چاہیے۔ انہیں چاہیے کہ اپنی ساری توجہ اپنے آپ پر مرتکز کر دیں حتیٰ کہ ان سب میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ باہم مل کر اسلامی جمہوریتوں کی ایک برادری کی شکل اختیار کر لیں[۳۱]۔

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اِک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر[۳۲]

حواشی

۱۔ اقبال، علامہ محمد، مقالات اقبال (مرتبہ عبدالواحد معینی) آئینۂ ادب چوک مینا رانارکلی لاہور، ص ۷۵

۲۔ اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۱۴۱

۳۔ اقبال، علامہ محمد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (ترجمہ نذیر نیازی) بزمِ اقبال کلب روڈ، لاہور، ص ۲۹۲

۴۔ فاروقی، محمد حمزہ، سفر نامۂ اقبال، مکتبۂ معیار کراچی، ۱۹۷۳ء، ص ۵۲

۵۔ اقبال، علامہ محمد، مقالات اقبال، (مرتبہ عبدالواحد معینی) آئینۂ ادب چوک مینار، انارکلی، لاہور، ص ۲۴۸

۶۔ Dar, B.A(ed) Latters and writings of Iqbal, Iqbal Academy pakistan Lahore, 1981, p.129

۷۔ اقبال، علامہ محمد، مقالات اقبال (مرتبہ عبدالواحد معینی) آئینۂ ادب چوک مینار، انارکلی، لاہور، ص ۷۹

۸۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، (مدیر) مجلّہ اقبال، بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور، جنوری ۱۹۹۶ء، ص ۶۰

۹۔ عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکر اقبال، بزمِ اقبال، کلب روڈ، لاہور، جون ۱۹۸۸ء۔ ص ۹۰

۱۰۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، مجلّہ اقبال، بزم اقبال، لاہور، جنوری ۱۹۹۶ء، جلد ۴۳ شمارہ ۱، ص ۶۰

۱۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے، الوقار پبلی کیشنز، ۵۰ لوئر مال روڈ، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۹۷۔

۱۲۔ اقبال، علامہ محمد مقالاتِ اقبال، ص ۲۴۸

۱۳۔ قادر، ڈاکٹر سی اے، فلسفہ جدید اور اس کے دبستان، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۱۸۶

۱۴۔ رفیق جعفر، پروفیسر، نفسیات کا ارتقاء، اظہار سنز ۱۹ اردو بازار، لاہور، اکتوبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۱۱۴

۱۵۔ ڈیورنٹ، ول، داستانِ فلسفہ (ترجمہ سید عابد علی عابد) مکتبۂ اردو، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۴۰۳، ۴۳۵

۱۶۔　علی عباس جلال پوری، روح عصر، آئینہ ادب چوک مینار، انار کلی، لاہور، ص ۱۳۸
۱۷۔　ڈیورنٹ، ول، داستان فلسفہ، ص ۴۵۰
۱۸۔　ڈیورنٹ، ول، داستان فلسفہ، ص ۴۶۵
۱۹۔　ڈیورنٹ، ول، داستان فلسفہ، ص ۴۶۵
۲۰۔　اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۳۴۵
۲۱۔　اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو) شیخ غلام علی یبنڈ سنز، لاہور، ص ۳۲۰
۲۲۔　محمود عاصم (مرتب) اقبال کے ملّی افکار، مکتبہ عالیہ ایبک روڈ لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۳۲۰
۲۳۔　اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، مارچ ۱۹۷۸ء، ص ۹۳۷
۲۴۔　قاسمی، احمد ندیم، (مدیر) اقبال (جولائی۔اکتوبر ۱۹۸۲ء) بزمِ اقبال لاہور، ص ۴۴
۲۵۔　اقبال، علامہ محمد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ: سید نذیر نیازی، ص ۱۲
۲۶۔　اقبال، علامہ محمد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ: سید نذیر نیازی، ص ۳۰۴
۲۷۔　محمود عاصم، اقبال کے ملّی افکار۔۔۔۔۔ص ۲۲۱
۲۸۔　اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۴۱۰
۲۹۔　محمود عاصم (مرتب) اقبال کے ملّی افکار، مکتبۂ عالیہ ایبک روڈ لاہور، ۱۹۷۷ء ص ۱۹۶
۳۰۔　اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۱۴۲
۳۱۔　اقبال، علامہ محمد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔۔۔۔ص ۲۴۵
۳۲۔　اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)۔۔۔۔۔ص ۲۶۵